ساتھ حضرت شاہ (سیّد نفیس الحسینی سے) بھی ملا اور برابر ملتا رہا، اور ان کے اخلاص اور ان کی نفیس خطاطی سے بھی لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان سے میری آخری ملاقات ہمارے ایک مشترک پرانے دوست ڈاکٹر سیّد ریاض الحسن گیلانی (حفظ اللہ) کے ساتھ سیّد احمد شہید نامی خانقاہ میں ہوئی جو شاہ صاحب (نفیس شاہ) نے مرحوم راوی کے کنارے بنائی ہے۔ اس ملاقات میں شاہ صاحب نے تفسیر الملتقط جو حضرت گیسو دراز کے نام سے چھپی ہے، ہم دونوں کو ہدیہ دی۔ خاکسار نے شاہ صاحب مرحوم سے کہا کہ یہ تفسیر معروف مفسر اور صوفی شیخ عبدالکریم قشیری کے قلم سے ہے جو اَب آٹھ جلدوں میں ڈاکٹر ابراہیم بسیونی نے قاہرہ سے شائع کر دی ہے۔ اس تفسیر الملتقط میں امام قشیری کی تفسیر 'لطائف الاشارات' کے اقتباسات کو 'لطائف' ہی کے نام سے نقل کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے مذکورہ بالا تفسیر (لطائف الاشارات) نہیں پڑھی، وہ یقیناً الملتقط نامی تفسیر کو حضرت خواجہ گیسو دراز ہی کی تفسیر قرار دیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ لندن میں انڈیا آفس لائبریری میں عربی یا فارسی مخطوطات کی فہرست کے مؤلف نے غلطی سے الملتقط میں نقل شدہ لطائف الاشارات کو حضرت خواجہ گیسو دراز کا کلام قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں ہے۔

خاکسار نے ۱۹۶۹ء میں اسلامک کلچرل سنٹر لندن کے ایک معروف سہ ماہی مجلّے: اسلامک کوارٹرلی (Islamic Quarterly) میں امام قشیری کی تفسیر لطائف الاشارات پر مفصل تبصرہ شائع کیا تھا اور یہ بتایا تھا الملتقط میں حضرت گیسو دراز نے شیخ عبدالکریم القشیری کے 'لطائف' کو نقل کیا ہے۔

سیّد نفیس شاہ صاحب ایک بھرپور روحانی زندگی بسر کرنے کے بعد ۵ فروری ۲۰۰۸ء بروز منگل ساڑھے پانچ (۵.۵) بجے صبح دُنیا کو چھوڑ وہاں پہنچ گئے جہاں ہم سب کو جانا ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ سیّد نفیس شاہ کے عزیز دوست ڈاکٹر سیّد ریاض الحسن گیلانی کی نگہٴ التفات سے سیّد احمد شہید نامی خانقاہ میں مقامی بستیوں کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کیا جا سکے گا۔

بحرِ احمر میں نپولین کا ایک تاریخی واقعہ

بائبل اور قرآن مجید کے بیانات سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بحرِ احمر کو عبور کر کے اپنی مقدس سرزمین پر گئے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ موجودہ وقت میں بحرِ احمر میں سویز گلف (Gulf of Sweze) ہی وہ مقام ہے جسے عبور کر کے بنی اسرائیل اپنی منزل تک پہنچے تھے۔ تاریخ کا یہ انوکھا واقعہ ہے کہ موجودہ عہد میں جب نپولین (Napolean) نے مصر پر قبضہ کیا تو اس کا ذوقِ تجسس اسے بحرِ احمر میں اس مقام پر لے گیا جہاں سے حضرت موسیٰ نے اپنی قوم کے ساتھ بحرِ احمر کو عبور کیا تھا۔

نپولین کے معروف مورخ Abbot نے لکھا ہے: ''ایک دن نپولین بحرِ احمر میں اس مقام پر پہنچا جہاں سے تین ہزار سال قبل بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ کی قیادت میں 'ارضِ موعود' کی طرف کوچ کیا تھا۔ جب نپولین وہاں پہنچا تو وہاں طغیانی کی لہر نہیں تھی۔ چنانچہ وہ پوری دلچسپی سے ان مقامات کو دیکھتا رہا کہ شام ہوگئی، جب اس نے واپسی کا ارادہ کیا تو شام کی مدھم روشنی غائب ہو چکی تھی، تاریکی تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ اور نپولین کی پارٹی راہ گم کر بیٹھی اور ریت کے ٹیلوں میں بھٹکنے لگی۔ مزید یہ کہ سمندر کی لہروں نے نپولین اور اس کی پارٹی کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ وہ سواروں کے پاؤں چھونے لگیں۔ اب موت یقینی تھی۔ اس نازک وقت میں نپولین کی حاضر دماغی اور بروقت قوتِ فیصلہ نے جس نے کبھی نپولین کا ساتھ نہیں چھوڑا، نپولین اور اس کے گھوڑے آدھی رات کنارے پہنچ ہی گئے۔ حالانکہ اُن کے سینے پانی کی

تند و تیز لہروں میں ڈوب گئے تھے۔ کناروں پر ان لہروں کی بلندی ۲۲ رفٹ تھی۔ ''اگر آج میں فرعون کی طرح ہلاک ہو جاتا تو یہ واقعہ ایک ''عظیم مقدس متن'' کی شکل میں عیسائی دُنیا کے واعظین کے ہاتھ میں ہوتا۔'' نپولین نے کہا۔

قرآن مجید کے متعدد مقامات پر مثلاً سورۂ الاعراف، طٰہٰ، سورۂ الشعراء میں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کی قیادت میں بنی اسرائیل کا بحرِ احمر عبور کر کے صحرائے سینا پہنچنے کا ذکر آیا ہے۔

مرحوم سرسیّد احمد نے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''جب فرعون نے مع اپنے لشکر کے بنی اسرائیل کا تعاقب کیا تو راتوں رات حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سمیت بحرِ احمر کی بڑی شاخ کی نوک میں سے پار اُتر گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت بہ سبب جوار بھاٹے کے جو سمندر میں آتا رہتا ہے، اس مقام پر کہیں خشک زمین نکل آئی تھی۔ کہیں پایاب رہ جاتی تھی۔ بنی اسرائیل پایاب اور خشک راستے سے راتوں رات بہ امن پار اُتر گئے۔ یہی مطلب صاف صاف آیت سے پایا جاتا ہے۔''(۱)

رشید احمد (جالندھری)

(۱) ''مقالاتِ سرسیّد''، ج ۴، مجلس ترقیٔ ادب، لاہور، ۱۹۶۵ء

Napoleon and an excursion to the red sea

In abbot's Life of Napoleon it is related that "one day, with quite a retinue, he (Napoleon) made an excursion to that identical point of the Red Sea which, as tradition reports, the children of Israel crossed three thousand years ago. The tide was out, and he passed over the Asiatic shore upon extended flats. Various objects of interest engrossed his attention until late in the afternoon, when he commenced his return, the twilight faded away, and darkness came rapidly on. The party lost their path, and, as they were wandering bewildered among the sands, the rapidly returning tide surrounded them. The darkness of the night increased, and the horses floundered deeper and deeper in the rising waves. The water reached the girths of the saddles, and dashed upon the feet of the riders, and destruction seemed inevitable. From that perilous position Napoleon extricated himself by that presence of mind and promptness of decision which seemed never to fail him. ..... The horses did not reach the shore until midnight, when they were wading breast deep in the swelling waves. The tide rises on that part of the coast to the height of 22 feet. 'Had I perished in that manner like Pharaoh,' said Napoleon, 'It would have furnished all the preachers in Christendom with a magnificent text against me." (Abbot's Life of Napoleon, Chap. 12, P. 96).

ایک سبق آموز تحریر

[صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن کی زبان سے اُن کی آپ بیتی کی چند سطریں]

''پہلی بات جو میں کہنا چاہوں گا، وہ یہ ہے کہ مَیں انتہائی عاجزی سے تسلیم کرتا ہوں کہ مَیں نے اس زندگی میں جو کچھ پایا ہے، مَیں اس کا حق دار نہ تھا اور نہ اب حق دار ہوں۔ نہ جانے کیوں قدرت اور ایشور نے اپنی شفقت و رحمت کا ہاتھ مجھ پر رکھا، اور میری زندگی کو جس طرح یہ ہاتھ چاہتے تھے، مجھے بتائے بغیر بناتے چلے گئے۔ میری بڑائی جو کچھ ہے، یہ پربھو کی کرپا اور ایشور کی دین ہے۔ البتہ غلطیاں، خامیاں، کوتاہیاں سب کی سب میری ہی ہیں۔ اور مَیں ان پر سچے دل سے نادم ہوں۔

مَیں بچپن ہی سے ایشور کی کرپا پر بھروسا کرتا آیا ہوں۔ مَیں شروع ہی سے اس دکھائی دینے والی دُنیا ہی کو سب کچھ نہیں تصور کرتا تھا۔ من میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ اس دُنیا سے پرے کوئی اور دُنیا بھی ہے۔ اور اس دُنیا کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں بلکہ صرف من ہی سے جان سکتے ہیں--- مجھے لگتا ہے کہ زندگی کے اتنے برسوں میں مَیں ہر برس، ہر مہینے، ہر ہفتے۔ ہر دن ہی نہیں پل پل گھڑی گھڑی بھگوان نے میری رہنمائی کی ہے--- اگر اپنی زندگی کو بنانا میرے اپنے بس کی بات ہوتی تو آج میری کشتی کسی ساحل پر لگی ہوئی ہوتی۔ اتنی بات تو یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے خواب و خیال میں بھی نہیں سوچا تھا کہ مَیں کسی دن راشٹرپتی بنوں گا۔ اور آزاد ہندوستان کا سب سے بڑا شہری کہلاؤں گا۔ یہ ساحل اور یہ منزل میری تلاش کا نتیجہ نہیں۔

کسی اور ہی کی فکر اور سوچ کی پیداوار ہے۔ کسی غیبی طاقت کی رہنمائی کی رہینِ منت اور کسی کی کرپا اور دیا ہے۔'' (دہلی کے ایک روزنامہ سے ماخوذ)

ڈاکٹر رادھا کرشنن کا شمار مشرق ہی کے نہیں دُنیا کے ممتاز مفکروں اور فلسفیوں میں ہے۔ اور بہ ظاہر اسلام سے بیگانہ ہیں۔ یہ زمزمۂ توحید اور مناجاتِ ربانی آپ نے اُن کی زبان سے سُن لی--- اب فرمائیے اس کے جواب میں ہے کوئی تقریر یا تحریر آپ کے مسلمان بادشاہوں یا صدر نشینوں یا آمروں میں سے کسی کی زبان یا قلم سے نکلی ہوئی ہو تو ضرور تلاش کر کے پیش فرمائیے--- ہے کوئی سبق اس کے اندر ہمارے مسلمان حکمرانوں خصوصاً صدرِ مصر کے لیے؟

[''صدقِ جدید'' لکھنؤ، ۵۔ مارچ ۱۹۶۵ء، ص ۳-۴]

رشید احمد جالندھری

اسلامی خلافت کیوں وجود میں آئی

[''اسلامی خلافت کیوں وجود میں آئی'' مرحوم ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی معروف کتاب الفتنہ الکبری، عثمانؓ سے ماخوذ ہے۔ یہ مضمون، لاہور کے ایک مرحوم رسالے ''چٹان'' ۲۳۔ اپریل ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ خاکسار ان دنوں جامعہ الازہر قاہرہ میں تھا۔

ان دنوں قاہرہ کی ادبی اور ثقافتی زندگی میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین، ڈاکٹر احمد امین اور عباس محمود عقاد جیسے دانشمند چھائے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین عرب دنیا میں بیسیوں صدی کے ابوالعلا معری تھے۔ تقریر اور تحریر دونوں کے 'بادشاہ'۔ تقریر کرتے تو بہ قول ڈاکٹر احمد امین ''محسوس ہوتا کہ طٰہٰ حسین ایک آسمانی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اور فرشتوں کی انگلیاں اس کے اوراق اُلٹ رہی ہیں۔'' ایک طرف طٰہٰ حسین اور ان کے ہم پایہ دانشمند ادب و ثقافت میں ایک نئی تاریخ رقم کر رہے تھے، تو دوسری طرف مرحوم جمال عبدالناصر کی انقلابی شخصیت نہر سویز میں برطانوی سیاست کا سفینہ ڈبو رہی تھی۔ جمال عبدالناصر کے بارے میں برطانوی وزیراعظم ایڈن (جس نے ۱۹۵۶ء میں مصر پر حملہ کیا تھا۔) سویز جنگ سے متعلق اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اُنہوں نے مغرب کے رہنماؤں کو خفیہ خطوط لکھے تھے کہ اگر عبدالناصر کی گرفت نہ کی گئی تو اُن سے مغرب کو وہی نقصان پہنچے گا جو عربوں (کی نشاۃ اولی) کے ابتدائی دنوں میں پہنچا تھا۔ جواہر لال نہرو کی خواہش پر جمال عبدالناصر نے نہرو-طٰہٰ حسین ملاقات کا انتظام کرایا تھا۔ قاہرہ کے ایک معروف ادبی مجلّہ میں تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔

طٰہٰ حسین عربی ادب کے ساتھ ساتھ یونانی، فرانسیسی اور اطالوی ادب کا بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ اس لیے اُنہوں نے سب سے پہلے فلاسفۂ یونان پر اپنی کتاب 'قادۃ الفکر' میں سقراط، افلاطون اور دوسرے یونانی فلاسفہ پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ بات محتاجِ بیان نہیں

کہ عرب اور مسلم دُنیا نے اپنے دورِ عروج میں یونان کے فلسفہ و ادب پر عبور حاصل کر کے عرب اور مسلم معاشرے کو ایران و یونان کے بلند پایہ فکری و ادبی اور سیاسی سرمایہ سے روشناس کرایا تھا۔]

''مَیں سمجھتا ہوں کہ حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر (رضی اللہ عنہما) نے اسلامی خلافت کو ایک تجربے کے طور پر قائم کیا تھا۔ جس کے ذریعے وہ ایک بلند مقصد تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر یہ تجربہ اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ شیخین کی تمناؤں پر یہ تجربہ اس لیے پورا نہیں اُترا کہ جس عہد میں یہ تجربہ کیا گیا وہ اس کے لیے موزوں نہ تھا۔ اس زمانے کا ذکر کیا بلکہ آج بھی جب کہ انسانیت نے ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے نظریۂ حکومت کے بارے میں نئی نئی صورتوں کو جنم دیا ہے، لیکن پھر بھی وہ اس سیاسی اور اجتماعی عدل و انصاف کے حصول میں ناکام رہی، جس کے قیام کا ابوبکرؓ اور عمرؓ نے بیڑا اُٹھایا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ انسانیت نے قیامِ حکومت کے لیے مختلف راستوں کی خاک چھانی ہے۔ کبھی اسے استبدادیت سے واسطہ پڑا، جس میں ظالم اپنے آپ کو خدا، یا ظلِ خدا سمجھتے تھے۔ ان ظالم بادشاہوں کے دور میں انسانیت نے بڑے دُکھ اُٹھائے۔ کیونکہ ملوکیت کو اس امر سے کوئی تعلق نہیں تھا کہ وہ اپنے قوانین میں مخلوقِ خدا کا پاس رکھے۔ بلکہ اس کے قوانین تو فقط اس کے ذاتی مفاد کے تابع ہوتے تھے۔ یہ دور ختم ہوا تو ارستقراطیت (اشراف کا طبقہ) کا عہد طلوع ہوا۔ جس میں عدل و انصاف کا حق صرف ایک خاص گروہ (اشرافیہ) کو دیا گیا۔ ارستقراطیت کا سورج غروب ہوا--- تو ڈکٹیٹرشپ کا عہد شروع ہوا۔ جس میں ظلم وستم کو پہلے سے کہیں زیادہ ''عروج'' حاصل ہوا۔ اس دور میں لوگوں کی عزت وشرافت پر ذلت و مسکنت کے پہرے بٹھا دیئے گئے۔ یہ دور ختم ہوا، تو دوسرے دور نے جنم لیا جس میں یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ پوری قوم میں معاشرتی عدل و انصاف کے قیام کے لیے ضروری ہے کہ حکومت کے پورے

اختیارات قوم ہی کے ہاتھ میں ہوں اور قوم اپنے لیے جن قوانین کو پسند کرے وضع کرے اور ان کی تنفیذ کے لیے وہی لوگ مامور ہوں جن کا قوم نے خود انتخاب کیا ہو۔

بلاشبہ اس نظام سے انسانیت نے کسی قدر سماجی انصاف پایا۔ آزادی و مساوات سے اسے حصہ ملا۔ مگر معاشرتی عدل و انصاف اس نہج پر قائم نہ ہو سکا کہ اس سے قوم کے تمام افراد کو اپنا حق ملتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نظام میں منتخب ہونے والے نمائندوں میں وہ لوگ بھی تھے جو حرص و آز کے بندے تھے۔ وہ دُنیاوی مفاد کے لیے جادۂ اعتدال سے ہٹ کر انہی راہوں پر چلتے تھے، جن پر کبھی ملوکیت، ارستقراطیت اور دکتاتوریت (ڈکٹیٹرشپ) چل چکی تھی۔

یہی وہ سماجی عدل و انصاف تھا، جس کے لیے اشتراکیت وجود میں آئی۔ ہر چند اشتراکیت نے معاشرے میں طبقاتی کشمکش کو ختم کرنے میں بڑا کردار ادا کیا۔ کام کرنے والے ہاتھوں کو اس امر کا حق دیا کہ وہ اپنے اعمال کا پھل خود بھی کھا سکیں اور عام شہری ذلت و خواری اُٹھائے بغیر زندگی بسر کر سکیں۔ مگر اس نظام نے لوگوں کی آزادی کو سلب کر لیا۔ ان کی آواز کو دبایا گیا۔ اور یہ آزادی اس حد تک سلب کی گئی تھی کہ آج اس نظام کے دیوتا خود چیخ اُٹھے ہیں کہ اُنہوں نے ماضی میں انسانیت کے چہرے کو مسخ کر دیا تھا۔ [سٹالن اُن کی نظر میں دُنیا بھر کے محنت کش مزدوروں کا عظیم ''پیغمبر'' تھا۔ کہتے ہیں جب مارچ ۵۶ء کو کامریڈ خروشیف نے ماسکو میں کمیونسٹ پارٹی کے ایک اجلاس میں سٹالن کے جرائم پر مشتمل ایک طولانی فہرست کو پڑھا تو اسے سُن کر تمیں اشتراکی ممبر بے ہوش ہو گئے تھے۔]

بہرحال اشتراکیت نے انسان کی متاعِ عزیز (آزادیٔ رائے کے اظہار) کو چھینا ہے اور وہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا جسے اشتراکیت کے خالق نے دیکھا تھا۔ ابھی انسانیت کو اشتراکیت کی قہرمانیوں سے نجات نہیں ملی تھی کہ اس پر ایک دوسری مصیبت ''فاشسزم'' (Fascism) کی صورت میں سامنے آ گئی۔ جس نے انسان کو سماجی عدل و انصاف اور آزادی دونوں ہی سے محروم کر دیا۔

انسانیت نے اپنے حصولِ مقصد کے لیے متعدد نظامہائے حکومت کو استعمال کر کے

خلافت میں حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں۔ مسلمانوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کسی سے مخفی نہیں ہے۔ آپ کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد معاشرے میں عدل و انصاف کا قیام تھا اور یہی وہ سماجی عدل و انصاف کا اصول تھا جو شیخین (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) کے ہاں حکومت کا بنیادی اصول تھا۔ چنانچہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلامی دعوت کے بنیادی اصول دو تھے۔

۱۔ توحید

۲۔ بنی نوع انسان میں امتیازی تفریق کا خاتمہ

''یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر و انثی. الخ'' (الحجرات:۱۳)

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہی دعوت قریشِ مکہ کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی کہ آپ نے بندہ و آقا، امیر و غریب، عرب اور غیر عرب کے درمیان مساوات کا نعرہ کیوں بلند کیا ہے؟ اور یہی وہ مساوات کا نعرہ تھا جس سے تاریخِ انسانی میں ایک نیا موڑ آیا۔ تمام انسان خدا کی نگاہ میں برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر وطن، نسل اور زبان کی بنیاد پر کوئی فوقیت نہیں ہے۔ مشرکینِ مکہ رسولِ کریم صلعم کے ذاتی اوصافِ حمیدہ کے اعتراف کے باوجود آپ کی اس دعوت کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوئے کہ معاشرے کے تمام افراد آپس میں یکساں حیثیت کے مالک ہیں۔

میرا (طٰہٰ حسین) اعتقاد ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قریش کو صرف اللہ کی طرف بلاتے اور آپ اُن کے اجتماعی اور اقتصادی نظام سے کوئی سروکار نہ رکھتے تو شاید قریش آپ کی دعوت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو جاتے اور آپ کے درپے آزار نہ ہوتے کیونکہ قریش اپنے بتوں سے بھی اخلاص نہ رکھتے تھے۔ بتوں سے ان کی نیازمندی اور خلوص اسی حد تک تھا کہ وہ اس میں اپنا ذاتی، مادی فائدہ تصور کرتے تھے۔

ان کے نزدیک بتوں کی پوجا بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں تھا۔ بلکہ یہ بت اُن کے لیے جلبِ زر کا ایک وسیلہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مشرکین کے بارے میں یہ نہیں کہا کہ وہ

ارض وسما کے خالق کے منکر ہیں۔ بلکہ یہ کہا ہے کہ وہ اپنے اصلی خالق کے اقرار کے ساتھ ساتھ بتوں کو بھی اس کا شریک ٹھہراتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ یہ کہا کرتے تھے کہ ہمیں ان بتوں سے کیا غرض، ہم تو اُن کی صرف اس لیے پوجا کرتے ہیں کہ اس طریق سے ہم اللہ کے نزدیک ہوسکیں۔ اور یہ بت ہمارے سفارشی ہیں۔ ما نعبد هم إلا ليقربونا الى الله زلفا. (الزمر:۳)

بہرحال قریش اپنے بتوں کی مذمت سننے پر اس قدر ناراض نہیں تھے جس قدر کہ وہ اپنے سماجی نظام پر تنقید سے۔ اور یہ بات تو کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ اسلامی کے سلسلہ میں ایک دفعہ قریش کے سرداروں سے اس حد تک نرمی فرمائی کہ بعض نادار مسلمانوں کی طرف دھیان نہ فرمایا۔ آپ کی یہ بے التفاتی اللہ کے ہاں ناپسند کی گئی، جس کی خبر ''سورۂ عبس'' کے ذریعے سے آپ کو دی گئی۔

اس سورت سے جہاں اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ رسولِ کریمؐ رسولِ حق ہیں۔ اگر آپ رسولِ حق نہ ہوتے تو اپنے ہی بارے میں ایسی آیات کی تخلیق کیونکر کر سکتے تھے، جن میں آپ کی اپنی فروگزاشت کا ذکر ہو۔ یہ آیات اس بات کی دلیل ہیں کہ قران مجید رسولِ کریمؐ کی ذہنی اختراع کا نتیجہ نہیں بلکہ خدائی کلام ہے۔

رسولِ کریم صلعم نے اپنی مکی اور مدنی زندگی میں اپنے ساتھیوں کے درمیان رہتے ہوئے تمام امور میں عدل وانصاف کا اس حد تک خیال فرمایا کہ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات جاگزیں ہوگئی کہ توحید، مساوات اور عدل وانصاف کا قیام اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ یہی عقیدہ تھا جس کی بنا پر جنگِ حنین میں ایک مسلمان نے رسولِ کریم صلعم سے کہا، آپ مالِ غنیمت کی تقسیم میں انصاف کیجیے۔'' پہلی مرتبہ تو آپ نے اس آواز پر دھیان نہ فرمایا۔ مگر جب یہ آواز دوبارہ بلند ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ ''تیرا برا ہو، اگر مَیں انصاف نہ کروں تو پھر کون ہے جو انصاف قائم کرے گا؟'' بعض مسلمانوں نے اس ''گستاخ'' کو سزا دینا چاہی مگر آپ نے روک دیا۔ کیونکہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ اپنے ساتھی کے حقِ تنقید یا اس کی آزادی کو چھین لیں۔ مگر خود رسولِ کریم صلعم کا یہ فعلِ مبارک اس لیے جائز تھا کہ آپ کو سورۂ ''برأۃ'' میں اس کی اجازت مل

چکی تھی۔

سیرتِ طیبہ کے قارئین جانتے ہیں کہ آپ نے ان امور کے علاوہ جن میں اللہ نے آپ کو امتیازی درجہ عطا فرمایا تھا، کبھی بھی اپنے آپ کو اپنے ساتھیوں پر ترجیح نہیں دی تھی۔ آپ کی پاکیزہ سیرت ایک کھلی ہوئی کتاب ہے، جس کے ہر ورق پر ثبت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمام امور میں برابر کے شریک تھے۔ جنگ ہو یا صلح، مسجد کی تعمیر ہو یا خندق کی کھدائی۔ ان سب میں آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ برابر مشقت برداشت کرتے رہے۔ اگر آپ کے بہادر اور جانثار ساتھیوں نے پتھر کی سلیں اور مٹی کی ٹوکریاں اُٹھائیں ہیں تو آپ نے بھی مسکراتے اور گنگناتے ہوئے برابر ان کاموں میں حصہ لیا۔ حالانکہ آپ کو اللہ نے اپنی نبوت اور وحی کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

رسولِ کریم صلعم نے اپنے عمل سے مساوات کا درس دیا، اس عظمت و جلالت کے مالک ہوتے ہوئے کہ خود عظمت کو اپنے تئیں ناز ہے کہ اس کا تعلق آپ جیسے ''انسانِ کامل'' سے ہے۔ آپ جب اس دُنیا سے تشریف لے گئے تو اپنے پیچھے کچھ نہ چھوڑا بلکہ فرمایا تھا کہ:

''ہماری انبیاء کی جماعت جو چیز ترکے میں چھوڑتی ہے، صدقہ بن جاتی ہے۔ ہم کسی کو اپنا وارث نہیں بناتے۔''

یہی وہ قولِ مبارک تھا جس کی بنا پر آپ کی چہیتی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا باغِ فدک سے محروم ہوگئی تھیں۔ آپ کی یہی وہ پاک سیرت ہے جس نے ہمیں بتایا کہ آپ نے زندگی بھر اپنے اہلِ بیت، صحابۂ کرامؓ اور دوسرے عوام الناس کے درمیان عدل و انصاف کی میزان کو برقرار رکھا ہے۔

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ کے دونوں ساتھی مقدور بھر آپ کی سیرتِ طیبہ پر چلے۔ بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے تو اپنی بساط سے زیادہ مشقت برداشت کرنے کا تہیہ کرلیا تھا۔ چنانچہ آپ نے امورِ خلافت کو انجام دینے کے ساتھ ساتھ کسبِ معاش کے لیے وہی طریقہ جاری رکھا جو قبل از خلافت تھا۔ مسلمانوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ آپ

''تکلیف مالایطاق'' کے دَور سے گزر رہے ہیں تو اُن کا دل بھر آیا۔ بلکہ خود آپ نے بھی یہ محسوس کر لیا کہ ایک ہی وقت میں خلافت اور معیشت کے امور سلجھانا مشکل ہے۔ چنانچہ اپنے ساتھیوں کے اصرار پر آپ نے بیت المال سے اسی قدر امداد لینا قبول کی جو آپ اور آپ کے خاندان کے لیے کفیل تھی۔ ''حضارۃ العرب'' میں لکھا ہے کہ یہ امداد صرف پانچ درہم یومیہ تھی۔''

ابوبکرؓ کی بلند شخصیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنی وفات کے وقت اس بات کو بُرا جانا کہ وہ خدا سے ملیں اور ان کے گھر میں بیت المال کی کوئی چیز موجود ہو۔ چنانچہ آپ نے اپنے گھر والوں کو یہ وصیت کی کہ بیت المال کی جو چیز اُن کے ہاں موجود ہے اسے عمرؓ کے سپرد کر دیا جائے--- صدیقِ اکبرؓ کی وفات کے بعد جب یہ سامان حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہوا تو اسے اپنی تحویل میں لیتے وقت آپ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے عمرؓ کو روکا کہ وہ اس سامان کو واپس نہ لیں۔ مگر عمرؓ نے اس خیال سے لے لیا کہ ابوبکرؓ اپنے رب سے کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ اُنہوں نے تو اپنے خاندان والوں کو بیت المال کی چیزیں واپس کر دینے کی وصیت کر دی تھی، مگر عمرؓ نے اسے لینے سے انکار کر دیا تھا۔

آپ کے بعد حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا۔ خلافتِ فاروقی کی عمر دس سال سے زیادہ ہے۔ مگر اس پورے دور میں حضرت عمرؓ نے قوم کے ساتھ وہی سلوک روا رکھا جو اُنہیں رسولؐ اور اُن کے پیش رو ساتھی حضرت صدیقِ اکبر سے ورثہ میں ملا تھا۔ آپ قوم کے رنج و غم میں برابر کے شریک رہے۔

آپ نے ایک دفعہ یہ محسوس کیا کہ قحط سالی کی وجہ سے لوگ گھی کا استعمال نہیں کرتے۔ تو آپ نے بھی گھی چھوڑ کر تیل کا استعمال شروع کر دیا، جس سے آپ کی صحت پر بُرا اثر پڑا، رنگ تک پھیکا پڑ گیا۔ مگر مسلمان حضرت عمرؓ کو تیل کے استعمال سے نہ روک سکے۔ کیونکہ آپ نے نہایت ہی وضاحت سے یہ فرمایا تھا کہ وہ اس وقت تک ''مرغن غذائیں'' نہیں کھا سکتے جب تک عوام الناس قحط سے نجات پا کر خوشحال نہ ہو جائیں۔ کاش! آج کے اہلِ اقتدار اپنی ہی تاریخ کی روشنی میں اپنے قول و عمل کا جائزہ لیں۔ اپنی تاریخ سے نہ سہی عہدِ حاضر کی تاریخ ہی

سے کوئی سبق لیں۔ [کہتے ہیں کہ لینن نصف روٹی کھاتا تھا، کیوں کہ اس کے اندازہ کے مطابق اس وقت کے مزدوروں کو نصف روٹی میسر آتی تھی۔]

حضرت عمرؓ نے احتساب کا یہ سلوک اپنے نفس کے ساتھ ہی روا نہیں رکھا بلکہ اپنے خاندان والوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتے رہے کہ کہیں وہ اس قحط سالی میں خوشحالی کی زندگی تو بسر نہیں کر رہے بلکہ آپ نے ان کو ایک دفعہ بلا کر تنبیہ کی تھی کہ اُنھوں نے فلاں فلاں امور کے ارتکاب پر سزا دینے کا اعلان کیا ہے، اگر تم میں سے کسی نے ان امور کا ارتکاب کیا تو اس پر تمہیں دگنی سزا دی جائے گی۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں یہ ثابت کر دیا کہ رسولِ کریم صلعم کی پاکیزہ سیرت ان کے لیے مشعلِ راہ ہے اور آپ نے اسی کی روشنی میں لوگوں میں مساوات اور عدل و انصاف کو قائم کیا۔ یہی وجہ تھی کہ آپ جہاں صحابہ کرام سے مشورے لیتے تھے جو آفتابِ رسالت سے براہِ راست مستنیر ہو چکے تھے، وہاں ان صحابہ کو مدینہ سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔

حضرت عمرؓ کو یہ خوف تھا کہ کہیں یہ صحابہ ملک کے دوسرے حصوں میں جا کر اپنی دینی وجاہت سے عام مسلمانوں کو فتنہ میں نہ ڈال دیں۔ جس سے ایک ہی وقت میں پوری ملت، حکومت اور صحابہ کی جماعت کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑے۔ [آپ کا یہ خطرہ درست تھا کہ صحابہ کی دینی وجاہت ''چودھراہٹ'' کا رنگ اختیار کر لے گی جو عوام الناس کے لیے بلائے بے درماں ہے۔ اس خطرے کی جیتی جاگتی وہ بیسیوں تصویریں ہیں جو آج پاک و ہند اور خاص کر پنجاب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جو حسب، نسب اور مذہبی پیشوائی کے نام سے اپنا کاروبار کر رہی ہیں۔]

صحابۂ کرام بیت المال سے اپنا حصہ لینے کے علاوہ تجارت بھی کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے ثروت سمٹ سمٹ کر ان کے پاس آنے لگی۔ حضرت عمرؓ اس امر میں متردد تھے کہ اس نئی صورتِ حال کا سامنا کس طرح کریں۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں

بھی آزادانہ تجارت کرتے تھے۔ مگر آپ اِس نئی صورتِ حال سے مطمئن نہ ہوئے اور کہہ اُٹھے کہ اگر ان کی حکومت واپس آ جائے تو وہ امراء سے ان کا زائد مال لے کر غریبوں میں بانٹ دیں گے۔ (۱)

چنانچہ آپ نے یہ اعلان کر دیا کہ بیت المال قوم کا مشترکہ اثاثہ ہے۔ جس میں کسی کو کسی پر ترجیح نہیں ہے۔ آپ نے طبقاتی تمیز کو ختم کر کے سوسائٹی کے ہر مرد، عورت، بچے، بوڑھے، مریض اور بے بس لوگوں کے لیے بیت المال سے وظیفے مقرر فرمائے۔

ان وظیفوں میں صرف مسلمان ہی شریک نہیں تھے بلکہ غیر مسلم نادار اور بے بس لوگ بھی شریک تھے۔ آپ نے ایک دفعہ مدینہ میں ایک غیر مسلم نابینا کو دیکھا جو فلک زدہ تھا۔ آپ نے تمام صورتِ حالات کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ قرآن میں ''صدقات'' کے مصارف میں سے ''مساکین'' بھی ہیں تم انہی مساکین کے ایک فرد ہو۔ چنانچہ ایک غریب غیر مسلم شہری کا ''شعبۂ زکوٰۃ'' سے وظیفہ مقرر کیا گیا۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ میں حصہ پانے والوں میں ''فقرا'' کا بھی ذکر آیا ہے۔ [علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر ''احکام القرآن'' میں غیر مسلم غریبوں کو بھی ''فقرا'' میں شمار کیا ہے۔ جنہیں زکاۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔]

معاشرے میں قیامِ عدل کے لیے کی جانے والی تاریخی مساعی کے باوجود ایک رات کسی محلے سے گزر رہے تھے کہ ایک بچے کے رونے کی آواز آئی جسے آپ نے دوسری اور تیسری رات بھی سنا۔ آپ نے اس بچے کی ماں سے رونے کا سبب پوچھا تو ماں نے بتایا کہ وہ

---

(۱) ''لو استقبلتُ ما استدبرتُ لا خذتُ فضول أموال الأغنياء و وزّعتُها بين الفقراء''

اسلامی جمہوریہ ایران کے سابق صدر ابوالحسن بنی صدر نے اپنی کتاب "Islamic Government" میں لکھا ہے: ''آغازِ اسلام میں جب اقتدار ملا، تو دولت نے عربوں کی طرف رُخ کیا اور لوگوں نے بڑے بڑے مکانات بنائے، تو حضرت عمر نے کہا: اگر میں ایک سال اور زندہ رہ گیا تو یہ دو دو منزلہ مکانوں کو جو دوسروں سے ممتاز نظر آ رہے ہیں، مسمار کر دوں گا۔ (ص ۸۲)

دیکھئے ایران کے پہلے صدر جناب بنی صدر کی انگریزی کتاب "The Principles And Precepts of Islamic Government" Lexington, K.Y. 40501, U.S.A.

اپنے بیٹے کو دودھ چھوڑنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کیونکہ عمر انہی بچوں کا وظیفہ مقرر کرتے ہیں جو دودھ نہ پیتے ہوں۔ آپ اس بات کو سن کر سکتے میں آ گئے۔ دوسرے دن اعلان کیا کہ دودھ پیتے بچوں کو بھی وظیفہ دیا جائے گا۔ اس لیے کسی بچے کو ماں کا دودھ چھوڑنے پر مجبور نہ کیا جائے۔

آپ کے اس اجتماعی نظام سے جو پوری سوسائٹی کے لیے خیر و برکت کا سبب تھا، یہ نہ سمجھا جائے کہ آپؓ بیسویں صدی کے کوئی ''اشتراکی لیڈر'' تھے۔ آپ نے اپنے نظامِ خلافت کی بنیاد انہی اصولوں پر رکھی جن کی رہنمائی اسلام اور پیغمبر اسلام نے کی تھی۔ آپ نے سماجی انصاف کو ذاتی ملکیت (جاگیرداری نہیں) اور ثروت (سرمایہ داری نہیں) کو منسوخ کیے بغیر قائم کیا اور آج کی نئی جمہوری حکومتیں بھی---''بعد از خرابیٔ بسیار'' اسی اخلاقی اور تاریخی روایت کی طرف آ رہی ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسلام کی دعوت کا پہلا رُکن توحید ہے کہ خدا کے علاوہ کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے۔ اور دوسرا اہم رُکن معاشرتی اور اجتماعی عدل و انصاف کا قیام ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھیوں نے اپنی خلافت کی ''غایت الغایت'' اسی رکن کو بنائے رکھا۔ اور اس اخلاقی ذمہ داری کے گہرے احساس کے ساتھ مسند خلافت کو قبول کیا کہ جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ قدرت کی آنکھ کر رہی ہے وہاں مخلوق کا یہ عزم بھی ان کے لیے مشعلِ راہ ہے کہ اُن (حاکم) کی ''ہر کجی کو تلوار کی نوک سے درست کر دیا جائے گا۔''

محمود مرزا

''نالج اکانومی'' (علمی معیشت) اور ہمارا اندازِ فکر

آیئے غور کریں کہ پاکستان میں موجودہ تہذیب اور ہمارا اندازِ فکر اکیسویں صدی کی اُبھرتی علمی معیشت (نالج اکانومی) کے تقاضوں سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔ ہم اس امر پر بھی غور کریں گے کہ ہمارے افکار اپنے فطری بہاؤ میں نالج اکانومی کی جانب پیشرفت کے لیے کتنے موزوں ہیں۔ یہاں بحث یہ نہیں کہ نالج اکانومی یا انفرمیشن ایج اچھی چیزیں ہیں یا نہیں۔ یہ معاملات ہمارے طے کرنے کے نہیں، انہیں سائنسی ترقی نے طے کر رکھا ہے۔ صنعتی دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو حیرت انگیز ترقی کی ہے یہ چیزیں اس کا فطری نتیجہ ہیں۔

علمی معیشت کا مختصر تعارف ضروری ہے۔ اس معیشت میں جدید ترین علم کو معاشی مفاد کے لیے بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا امریکہ میں 1955ء میں ہوئی جب کمپیوٹر کا معاشی عمل میں استعمال شروع ہوا۔ کمپیوٹر معلومات کے ذخیرے تک رسائی مہیا کرتا ہے اور معلومات ایک جگہ سے دوسری جگہ فی الفور منتقل کرتا ہے۔ جب کمپیوٹر کو پیداواری عمل میں شریک کیا جائے تو عمل میں تیزی اور معیار میں عمدگی پیدا ہوتی ہے۔ علمی معیشت میں میٹریل میں بھی تبدیلی آئی۔ بہت سا میٹریل انسان سائنسی معلومات کی بنیاد پر خود تیار کرنے لگا ہے۔ کارکنوں کے اعتبار سے اس معیشت کی خصوصیت یہ ہے کہ عام طور پر ان کی دماغی صلاحیتوں کا کردار بڑھ گیا ہے۔ جدید مشینوں میں کام کی نوعیت کو پرکھنے اور سوچنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ آسان الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ علمی معیشت میں مشین میں انسانوں کی طرح سوچنے کی صلاحیت

اُجاگر کر دی گئی ہے۔ جبکہ صنعتی دور میں عام محنت کش غبی مشین کی طرح کام کرتا تھا۔ علمی معیشت کا کارکن اپنی صلاحیت بروئے کار لانے کے لیے جسمانی ہی نہیں بلکہ نفسیاتی اور وجدانی طور پر معاشی عمل میں ڈوبنے پر مجبور ہوتا ہے، وگرنہ اس کی کارکردگی ناقص ہوگی۔ مشینوں کی کارکردگی جتنی بڑھتی جارہی ہے، صنعتی کارکنوں کی مطلوبہ تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ علمی معیشت کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ عالمی معیشت کی کل پیداوار میں جو اضافہ واقع ہو رہا ہے، وہ جدید ہائی ٹیک ایجادات اور ریسرچ کا مرہونِ منت ہوتا ہے۔ 1997ء کے اعداد و شمار کے مطابق دُنیا کی ترقی یافتہ بیس فیصد آبادی کے پاس عالمی دولت کا 86 فیصد حصہ تھا، جبکہ بیس فیصد پسماندہ آبادی کا حصہ صرف 1.3 فیصد تھا۔ گویا دولت پسماندہ ممالک کی جانب سے ترقی یافتہ ممالک کی طرف منتقل ہوتی جارہی ہے۔

ہائی ٹیک ایج میں وہ ممالک معاشی سبقت حاصل کر رہے ہیں جو برقی شعاعوں، بیالوجی، جینومکس اور میٹابولک انجینئرنگ میں نسبتاً ترقی یافتہ ہیں۔ یہ علوم پیداواری عمل اور انسانی زندگی کے بے شمار شعبوں میں انقلابی تبدیلی پیدا کر رہے ہیں۔ اکیسویں صدی بیالوجی کی ہوگی۔ اس سائنس میں زبردست ترقی جاری ہے۔ جینومکس (جینیاتی علوم) نے اسے بڑی وسعت اور گہرائی دی۔ ماہرین کے بقول جینیاتی انقلابات ہمارے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ یعنی بات Synthetic Biology (سینتھٹک بیالوجی) اور Bio-informatics تک پھیل چکی ہے۔ ان علوم نے زرعی پیداوار کو Ethanol کی تیاری کی طرف موڑ کر خوراک کی عالمی قلت اور مہنگائی پیدا کر دی ہے۔ (ایتھونل مہنگے پٹرول کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔) یہی مثال ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ سائنسی ترقی کو انسانی فلاح کے مقصد سے متصادم نہیں ہونا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے عالمی سطح پر ایسے اصول وقواعد بنانے پڑیں گے کہ انسانوں اور ماحولیات کے بہبود کے مقاصد سے نہ صرف انحراف نہ ہو بلکہ یہ مقاصد آگے بڑھتے رہیں۔ یہ کام آسان نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو سائنسی اعتبار سے ترقی یافتہ قومیں اس پوزیشن میں ہوں گی کہ پسماندہ قوموں کو کسی نہ کسی بحران میں مبتلا رکھیں۔

علمی معیشت ان معاشروں میں پروان چڑھی ہے جہاں سوچنے کی آزادی تھی اور تحقیق اور ایجادات کے لیے معاوضہ بہت زیادہ تھا۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ معاشی پیداوار میں جو اضافہ واقع ہو رہا ہے، اس کی 70 سے 80 فیصد وجہ سائنسی ریسرچ اور اعلیٰ ٹیکنالوجی ہے۔ 2005ء کے اعداد و شمار کے مطابق دُنیا کی کل پیداوار 44.4 ٹریلین ڈالر تھی جس کا 29.28 فیصد حصہ امریکا کی علمی معیشت کا ہے۔ دوسرے نمبر کی علمی معیشت جاپان کی ہے جس کا عالمی پیداوار میں حصہ 10.81 فیصد ہے، تیسرے درجے پر جرمنی ہے جس کا حصہ 6.76 فیصد ہے۔ چوتھے درجے پر برطانیہ ہے، جس کا حصہ 5.63 فیصد ہے۔ گویا دُنیا کی پیداوار کا نصف سے زیادہ حصہ ان چار ممالک سے آتا ہے جو ٹیکنالوجی کے اعتبار سے بڑے ترقی یافتہ ہیں۔ کچھ دوسری مغربی معیشتیں بھی علمی ہیں۔ ''نالج اکانومی'' کے حامل مغربی ممالک اور جاپان ''نالج سوسائٹی'' شمار ہوتے ہیں جہاں فکری آزادی ہے اور وہ متوقع تبدیلیوں کا پیشگی اندازہ کر کے ضروری اصلاحات کر لیتے ہیں۔ جنوبی کوریا علمی معیشت میں داخل ہو رہا ہے اور چین اور بھارت بھی اسی جانب رواں ہیں۔ تاہم یہ معاشرے علمی نہیں، ان کی قیادت مستقبل شناس ضرور ہے۔ بھارت کی کمپیوٹر سروسز کے ذریعے زرِمبادلہ کی آمدن تیس ارب ڈالر سے زیادہ ہے۔ بھارت میڈیکل سروسز کے ذریعے بھی اربوں ڈالر کا زرِمبادلہ کمانے لگا ہے۔ خیال رہے کہ پاکستان کی کمپیوٹر سروسز سے آمدن ایک ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے۔ نالج اکانومی کو پروان چڑھانے میں ملٹی نیشنل کارپوریشنوں نے اہم کردار ادا کیا۔ عالمی معیشت کے پیداواری اثاثوں کے 25 فیصد کی مالک 300 بڑی کارپوریشنیں ہیں۔ آزاد عالمی معیشت کا انتہائی افسوسناک پہلو یہ ہے کہ یہ ایک جانب ترقی یافتہ اور پسماندہ ملکوں کے مابین اور دوسری جانب ہر ملک کے امیر اور غریب طبقات میں دولت کی تقسیم کا فرق بڑھا رہی ہے۔ یہ معاملہ الگ مفصل بحث کا طالب ہے۔ اشارۃً عرض ہے کہ منصفانہ نظام کے قیام کے لیے ایک جانب عالمی سطح پر اور دوسری جانب ہر ملک میں قومی سطح پر ذمہ دار سیاسی تحریک چلانے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ معاملہ پاکستان کو اپنی معیشت کو جدید ترین علوم پر استوار کرنے سے تاخیر کا جواز فراہم نہیں کرتا۔

اب ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ہم جدید علوم اور ٹیکنالوجی پر قائم معیشت کی طرف پیش رفت کے لیے کیا منصوبہ بندی کریں؟ یہ منصوبہ بندی پاکستان کے سب علاقوں کے لیے یکساں نہیں ہوگی۔ سماجی ارتقا کے اعتبار سے ہمارے یہاں تین طرز کی تہذیبیں ہیں۔ کچھ علاقوں میں قبائلی نظام رائج ہے، کئی زرعی علاقوں میں فیوڈل نظام پایا جاتا ہے اور نسبتاً ترقی یافتہ علاقوں میں آسان ٹیکنالوجی کی صنعتیں پائی جاتی ہیں۔ گنجان شہروں میں صنعتوں کے علاوہ تجارت اور معاشی سروسز فروغ پا رہی ہیں۔ کوئی علاقہ بھی اعلیٰ سائنس اور جدید ٹیکنالوجی پر منحصر معیشت کی ذمہ داری اُٹھانے کا اہل نہیں۔ ہر علاقے کے لیے ترقیاتی منصوبہ بندی الگ الگ ہوگی۔ یقیناً 25، 30 سال کی منصوبہ بندی سے ہم جدید سائنس پر قائم معیشت استوار کر سکیں گے۔ تاہم دُنیا میں امن اور انصاف کی ضرورت ہے۔ اس کا امکان اسی صورت میں ہے کہ ادب، فلسفہ اور سماجی علوم سے بھی اغماض نہ برتا جائے۔

معاشی ترقی کے منصوبوں، سماجی ارتقاء کے تقاضوں اور نظامِ تعلیم میں ایک ربط ہونا چاہیے۔ منصوبے سلسلہ وار ہوں۔ پہلا منصوبہ فوری عملدرآمد کے لیے ہو، دوسرا دس سالہ ہو اور تیسرا پچیس سالہ۔ اگر جمہوری استحکام ہو، قانون کی عملداری ہو، منصوبہ بندی ہو، نظامِ تعلیم جدید ہو اور سب سے بڑھ کر ترقی کی لگن ہو تو پھر سرمایہ کاری اور ہنرکاری کے دروازے کھل جاتے ہیں اور ترقی کا سفر جو یورپ نے ایک صدی میں طے کیا، ہم ایک دہائی میں مکمل کر لیں گے۔ تین دہائیوں میں ہم یورپ کے تین سو سال کا سفر طے کر سکتے ہیں۔

علمی معیشت قائم کرنے کے لیے اصلاحات کے کئی کام حکومت کے کرنے کے ہیں اور کئی کام سیاسی پارٹیوں کے۔ مگر کئی کام ایسے ہیں جو غیرسیاسی تنظیمیں کیا کرتی ہیں۔ اس معاملے میں باشعور حلقوں کو رائے عامہ تیار کرنے کی ذمہ داری اُٹھانی ہوگی۔ انہیں تعلیم کا نصاب اور سوچ کا انداز نالج اکانومی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ اگر ہم نے یہ کام نہ کیا تو ظاہر ہے، ہمارے یہاں پسماندگی کو نہ صرف دوام ملے گا بلکہ اس میں اضافہ ہوگا۔

ہمیں غور کرنا ہوگا کہ پاکستان سائنسی ترقی اور علمی معیشت کے تقاضے پورے کرنے

کے قابل کیوں نہ بنا۔ اس سوال کو ہم یوں بھی اُٹھا سکتے ہیں کہ پاکستان میں جدید علوم کو فروغ کیوں حاصل نہ ہوا۔ ہمارا سماج فیوڈل اور قبائلی تھا اور سماجی قوتیں جن کے پاس رہبری کا فریضہ تھا، اُن کا رویہ غیر سائنسی اور روایتی مذہبی تھا۔ سیاسی عمل کے دوران میں مؤثر حلقوں کی توجہ اسلامی نظریے سے جذباتی اظہار پر مرکوز ہوگئی۔ 1949ء میں قرار داد مقاصد کے ذریعے پاکستان کی پارلیمان کے اکثریتی (مسلمان) ارکان نے اسلامی تعلیمات کو مسلمانوں کی نجی زندگی اور ملک کی قومی زندگی کے لیے مشعل راہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ جہاں تک قومی زندگی کا تعلق ہے، ہمارے پاس بیسویں صدی (جو تب تھی) کے اہل کوئی ماڈل نہیں تھا۔ ہمارے پاس عقیدہ تھا، جوش تھا، علم اور صلاحیت نہیں۔ عالم اسلام میں کہیں بھی صنعتی دور (جو تب تھا) کے تقاضوں کے مطابق اسلامی افکار میں قابلِ ذکر اجتہاد نہیں ہوا۔ کچھ معاملات، جن میں پیشرفت ہوئی، قومی زندگی میں اہم کردار کے حامل نہ تھے۔ پاکستان کے رہنماؤں نے شروع شروع میں ''اسلام کی راہ'' اختیار کرنے کی بات کی۔ اُنہوں نے طے کیا کہ قانون سازی اور دوسرے امور میں کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جو اسلامی تعلیمات کے خلاف ہو۔ 1977ء کے بعد ایک فوجی حکمران نے قانون بنایا۔ جس کی رو سے تصادم سے بچنے کی پالیسی کے ساتھ ساتھ، شریعت کے نفاذ کی آئینی ذمہ داری بھی قبول کر لی گئی۔

یہاں مسلمانوں کے مذہبی افکار میں جمود کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ بے شبہ جمود ہماری سماجی زندگی کے ہر شعبے پر اثر انداز ہوا۔ ہمارے مذہبی افکار میں جمود فطری تھا، اس لیے کہ سماجی علوم اور سماجی فکر میں جمود موجود تھا۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ آٹھ سو سال پہلے مسلمانوں کی تہذیبی ترقی رک گئی اور زوال کی ابتداء ہوئی۔ ہمارے ہاں عام خیال کے مطابق مسلمانوں کے زوال کا سبب جدید علوم وفنون سے اغماض اور فکری قیادت کی نااہلی نہیں بلکہ روایتی مذہب کی تقلید میں کوتاہی ہے۔ ہم نے ماضی کو سراہا ہے۔ ہم نے مستقبل کے لیے تیاری نہیں کی۔ ہمارے لیے توجہ کے قابل مستقبل مرنے کے بعد آئے گا۔ اس لیے ہماری دُنیاوی زندگی پسماندہ رہی، سوائے بالادست طبقات کے جنہوں نے اخلاقی اقدار ترک کر کے دولت حاصل کی مگر عوام کو